ہیں۔ اصل بات تو ECOLOGY کی ہے۔ اگر وہ جما پلا بڑھا پنجاب میں تو بس پنجاب کا ہُوا۔"

اِس پر سب نے کہا: "لو اَب مُفتی بھی پنجابی شدن اِزم کا شکار ہو گیا۔"

ہم سب ہنسنے لگے۔ تو عماد نے کہا: "اس بات کا فیصلہ تو کسی پڑھے لکھے آدمی سے پھر کبھی کروالیں گے۔ اَب تم آگے چلو شاہ جی۔"

مَیں نے کہا: "بس نمازِ عصر کا وقت تھا۔ دھوپ میں تمازت تھی۔ مَلک فخر الدین جُونا اللہ پر بھروسہ کرکے اپنے چند غلاموں کے ساتھ برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہُوا اور اپنے والد کی مملکت کی طرف دیپالپور کو چل نکلا۔ مغرب کے وقت خسرو خاں کو اُس کے فرار کی خبر ملی تو اُس نے ایک بھاری جمعیت اُس کے تعاقب میں روانہ کی، لیکن مَلک جُونا دِنوں کی منزلیں گھنٹوں میں طے کرتا اپنے باپ کی حدُودِ مملکت میں پہنچ گیا۔ بیٹے کے صحیح سلامت پہنچنے پر غازی مَلک غیاث الدین نے خدا تعالےٰ کا شکر ادا کیا۔ صدقات تقسیم کیے اور طبلِ شادمانی بجوائے۔

دوسرے روز جب غازی مَلک غیاث الدین کو خبر ملی کہ خسرو خاں کا مرتد بھائی اور اُس کے ہوا خواہ ایک بڑا لشکر لے کر دیپال پور حملہ کرنے آرہے ہیں تو اُس نے بھی اپنے قدیم وفادار ساتھیوں اور نمک حلال متبعین کو ساتھ لے کر اس لشکر سے ٹکر لینے کا ارادہ باندھا۔ وہ دیپال پور سے نکل کر قصبہ دیلی سے گزرا اور دریا عبور کرکے دشمن کے سامنے آگیا۔ پہلے ہی حملے میں سلطان غیاث الدین نے اُن کافر نعمتوں کے لشکر کو شکست دے دی۔ خسرو خاں کے مرتد بھائی کا چتر اور دُور باش اور وہ تمام خزانہ اور ہاتھی گھوڑے غیاث الدین کے قبضے میں آگئے جو خسرو خاں نے ایک جری لشکر کی معیت میں روانہ کیے تھے۔

اُن لوگوں کی شکست اور غازی ملک کی فتح کا حال سُن کر خسرو خاں اور اُس کے ساتھیوں کا خُون خشک ہو گیا۔ براووں کے دل ٹوٹ گئے اور کافر نعمتوں کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ اس فتح کے بعد غازی مَلک ایک ہفتہ تک اُسی میدان میں مقیم رہا اور اپنی فوج کو آراستہ کرتا رہا۔ پھر اُس نے دِلّی کی طرف کوچ کرنے سے پہلے مَلک بہرام ایبہ، مَلک مغلطی عین الملک شہابی ملتانی امیر سیوستان اور مَلک یک لکھی امیر سامانہ کو کمک کے لیے خط لکھے اور اُنہیں دینِ برحق اور اسلام کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ اِس آڑے وقت میں اُس کی مدد کریں۔ اُن میں سے ملک بہرام ایبہ غازی

ملک کا خط ملتے ہی اس کے پاس پہنچنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ ملک مغلطی امیرِ ملتان نے جواب میں لکھا کہ وہ سلطانِ دہلی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ غیاث الدین کو بھی اُس نے یہی رائے دی کہ وہ خسرو خاں پر حملہ کرنے سے باز رہے۔ ملک محمد شاہ پسر امیرِ سیوستان نے لشکر تیار نہ ہونے کا بہانہ کر دیا اور سامانہ کے حاکم ملک یک لکھی نے غازی ملک کا وہ خط سیدھا خسرو خاں کے پاس دِلی پہنچا دیا۔

اپنے ایمان و اعتقاد پر بھروسہ کرکے دیپال پور کا یہ تغلق جاٹ اکیلا ہی دِلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ جمعہ کے دن غازی ملک غیاث الدین اندرپت کے حوالی سے وفاداروں کی جماعت ساتھ لے کر خسرو خاں کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ خسرو خاں بھی اپنے ہندو دوں برادوں اور موقع پرست مسلمان حواریوں کے ساتھ اپنی فرودگاہ سے روانہ ہُوا۔ ہراوت کے میدان میں دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابلے میں آکر صف آرا ہوئے۔ دونوں کے ہراولوں میں جھڑپ ہوئی جس میں غازی ملک کو فتح نصیب ہوئی۔ نمازِ عصر کے وقت تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے رہے اور خوب گھمسان کی جنگ ہوئی۔ پھر غازی ملک نے اللہ کا نام لے کر اور سبز پھریرہ ہوا میں لہرا کر خسرو خاں کے قلب لشکر پر حملہ کر دیا۔ زن صفت خسرو خاں مردوں کے حملے کی تاب نہ لاکر، بھیڑوں کی طرح بھاگا۔ اس کی صفیں منتشر ہوگئیں اور لشکر نے شکست کھائی۔ وہ لشکر سے جُدا ہو کر تلپت کی طرف بھاگ گیا اور پھر رات گئے شادی خاں کے خطیرہ میں جا چھُپا۔ لوگ اُسے پکڑ کر لے آئے اور اُس کی گردن اُڑا دی گئی۔

غازی ملک فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا دِلی میں داخل ہُوا۔ قصرِ ہزار ستون میں اُس نے امیروں اور سرداروں کی ایک مجلس آراستہ کی اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے تخت کے پہلو میں دست بستہ کھڑے ہو کر بولا: "میں اُن لوگوں میں سے ایک ہوں جن کو سلطان علاؤالدین اور سلطان قطب الدین نے بلند مرتبے پر پہنچایا ہے۔ اِس جذبۂ نمک حلالی کی وجہ سے میں نے اپنی جان بازی پر لگائی اور اپنے ولی نعمت کے دشمنوں اور تباہ کرنے والوں کے خلاف تلوار اُٹھائی۔ اب تم لوگ جو علائی اور قطبی حکومت کے اراکین اور بزرگان میں سے ہو یہاں ہمارے ولی نعمتوں کے خاندان میں سے کوئی زندہ بچا ہو تو اُس کو اسی وقت لاؤ اور

تخت پر بٹھا دو۔ مَیں اپنے مولیٰ کے سامنے کمربستہ ہو کر کھڑا ہوں گا اور اُس کی خدمت بجا لاؤں گا۔ اگر دشمنوں نے ان دونوں خاندانوں کا کلیتاً صفایا کر دیا ہے تو تم جس کو تخت کا سزاوار اور بادشاہی کے لائق سمجھتے ہو اس کے متعلق طے کر لو اور اس کو تخت پر بٹھلا دو۔ مَیں بھی اس کی اطاعت کروں گا اور اس کے حکم سے سر نہیں پھیروں گا۔ مَیں نے جو تیغ زنی کر کے اپنے مربیوں کا انتقام لیا ہے اور اسلام کی نصرت کے لیے جو کام کیا ہے یہ حکومت کے لالچ کی وجہ سے اور تخت حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا۔ آپ لوگ اس وقت جس کو منتخب کریں گے، مَیں اُس کے سامنے عقیدت کے سینے پر ہاتھ رکھ کر نیازمندی کے سر کو جھکا دوں گا۔

اُن سب بزرگوں نے جو وہاں موجود تھے یک زبان ہو کر کہا کہ سلطان علاؤالدین اور سلطان قطب الدین کی اولاد میں سے اس وقت کوئی بھی زندہ باقی نہیں بچا جو اس تخت پر بیٹھ سکتا۔ تُو کہ غازی مَلک ہے ہم پر تیرے بہت سے حقوق ہیں کئی سال سے تو مغلوں کے حملے روکنے کے لیے دیوار بنا ہُوا ہے۔ تیری ہی وجہ سے ہندوستان پر مغلوں کی آمد کا راستہ بند ہے۔ اِس موقع پر بھی تو نے وہ کام کیا ہے کہ تیری نمک حلالی کا ذکر تاریخوں میں لکھا جائے گا۔ تُو ہی وہ مسلمان ہے جس نے حکومت کو ہندوؤں اور برادوں کے غلبے سے چھڑایا ہے۔ ہم سب لوگ بلکہ اس مُلک کے تمام مسلمان تیرے اس احسان کے لیے ممنون ہیں ہم سب لوگ جو یہاں پر جمع ہیں بادشاہی کے لائق اور حکمرانی کا سزاوار تیرے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتے۔ عقل و دانش نیز استحقاق و دیانت کی بنا پر تیرے سوا نیابتِ تخت کے لیے کسی اور کو مناسب نہیں سمجھتے؛ چنانچہ اربابِ حل و عقد نے متفق ہو کر غازی مَلک کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو تخت پر بٹھا دیا۔

فضا میں بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر لیڈر نے پوچھا: "یہ دیپالپور ہے کس طرف"؟

مَیں نے کہا اگر تم لاہور سے بس میں سوار ہو کر ساہیوال کی طرف جاؤ تو راستے میں اوکاڑہ آتا ہے۔ اوکاڑہ شہر سے دو ڈھائی میل پہلے یا شاید اس سے بھی کم ایک اڈہ ہے جہاں بہت سی لاریاں اور ٹرک کھڑے ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بے شمار ہوٹل ہیں۔ یہاں سے بائیں جانب کو ایک چھوٹی سی سڑک جاتی ہے اور یہ دیپالپور کا راستہ ہے۔"

اس ساری داستان کا مسعود کے دل پر ایسا اثر ہُوا کہ وہ ہم سب کو چھوڑ کر پلٹا اور جلدی جلدی واپسی کے راستے پر چلنے لگا۔

"مسعود۔ مسعود۔ رُکو۔ ٹھہرو۔ دیکھو۔ سُنو۔ مسعود۔" ہم سب کی آوازیں یکے بعد دیگرے فضا میں گونجنے لگیں۔ لیڈر اُس کے پیچھے بھاگا اور چند ہی قدموں پر اُسے جا لیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" لیڈر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کہیں نہیں۔" مسعود نے رُکے بغیر جواب دیا۔ "میرا رومال شاید وہاں پیچھے گر گیا ہے۔ اُسے دیکھنے جا رہا ہوں۔"

مسعود اپنے رومال کی تلاش میں کافی دُور نیچے کو چلا گیا اور ہم سب اس کے انتظار میں کھڑے رہے۔ جب وہ واپس لَوٹا تو اُس کے پاس اُس کا رومال نہیں تھا۔ ہماری طرف آتے ہوئے ابھی بھی وہ زمین کی طرف دیکھتا چلا آ رہا تھا اور اُس کا خیال تھا کہ لٹھے کا وہ چیتھڑا اُسے کہیں نہ کہیں مل جائے گا جو اس کی بیوی نے پُرانے غلاف سے پھاڑ کر بنایا تھا۔

تلاش کا عمل بھی خوب ہے۔ لوگ نیلے آسمان پر عید کا چاند تلاش کرتے ہیں۔ قدموں کا نشان دیکھ کر چور کا کھوج لگاتے ہیں۔ کلائی ہاتھ میں لے کر معدے کے اندر حدت تلاش کرتے ہیں۔ کھنڈرات دیکھ کر پُرانے لوگوں کا چلن ڈھونڈتے ہیں۔ شادی کے لیے اچھی نسل تلاش کرتے ہیں۔ خوش وقتی کے لیے اچھا جسم تلاش کرتے ہیں۔ جب بچہ گھر نہیں پہنچتا تو ماں اُس کو تلاش کرنے کے لیے دیوانہ وار راہوں اور شاہراہوں پر نکل جاتی ہے۔ جب اُسی بچے کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی بیوی کے کھانوں میں ماں کے پکوانوں کی بُو باس تلاش کرتا ہے۔ جب نوجوان اُداس اور تنہا ہوتا ہے وہ جیون ساتھی تلاش کرتا ہے اور جب اُسے زندگی کا ساتھی مِل جاتا ہے تو وہ اُسے گھر چھوڑ کر دوسروں کے جیون ساتھیوں کا نظارا کرنے باہر نکل جاتا ہے۔

کچھ آدمیوں کو خبر ہوتی ہے کہ وہ تلاش کرنے جا رہے ہیں، جیسے مسعود کو علم تھا کہ اُس کا رومال گر گیا ہے اور وہ اُس کی تلاش میں جا رہا ہے یا میجر لیئر کو علم تھا کہ وہ کرگدانا تلاش کر رہا ہے۔ . .
اُنیسویں صدی کے اوائل میں کمپنی بہادر کا ایک میجر ڈیرہ دون میں تعینات تھا جو اپنی شرافت، نجابت، کم سخنی اور دھیمے مزاج کی وجہ سے گوروں اور دیسیوں میں یکساں طور پر ہر دلعزیز تھا۔ اس

میجر لیئر کے تین بچے اور سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی ایک بیوی تھی جو گھڑ سواری کی بہت شوقین تھی۔ اس کے بنگلے پر طرح طرح کے گھوڑے بندھے تھے۔ وہاں کچھ اسی قسم کے گھڑ سوار بھی مختلف سرونٹ کوارٹروں میں جمع ہوتے تھے۔ ان میں ٹھاکر گھڑ سوار سندھی عرب شہسوار یا غستانی سوار، مغل چابک سوار اور ٹٹو اور سانڈنی کے پیٹھ سوار، سبھی قسم کے لوگ ہوتے۔ میم صاحب اُن لوگوں سے بہت متاثر تھیں اور ان کے ساتھ گھنٹوں گھوڑوں کی باتیں کیا کرتیں۔

میجر لیئر بہت ہی شریف قسم کا فوجی آدمی تھا۔ اپنے باپ کے تتبع میں وہ فوج میں داخل ہُوا۔ دوسرے برٹش آفیسروں کی ہمیشہ عزت کرتا رہا۔ شام کو کلب میں سوڈا اور وہسکی پیتا۔ کالے لوگوں سے انسانیت کے ساتھ پیش آتا۔ اُدھار لیتا تو رقم وقت پر لوٹا دیتا۔ خوشی کے موقع پر خوش، غمی کے موقع پر ایک جھرجھری اور اتوار کے روز گرجے۔ ملکہ کا نمک حلال اور بکنگھم پیلس کا عقیدت مند لیکن اس میں اپنے دوسرے فوجی افسروں کے مقابلے میں ایک پیچ زیادہ کسا ہُوا تھا وہ یہ کہ میجر لیئر ایک تفریحی محقق بھی تھا۔ اس کو الول جلول ڈائریاں لکھنے اور بیہودہ قسم کی تحقیق کرنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے بھانویں وہ ایک عالم تھا جو علم اور عمل کے میدان میں ہفت خواں طے کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس شوق نے اس کو پُرانے مسوّدوں اور مخطوطوں کا خریدار بنا دیا تھا اور وہ قدیم مسوّدوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتا بھی رہتا تھا۔ اس کے مسوّدوں کا بہترین سپلائر سکم کا ایک کباڑیا تھا جو یاوہ گوئی اور چرب زبانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے کردار سے اور اُس کی گفتگو سے متاثر ہو کر میجر لیئر سکمی کباڑیے کا یار بن گیا۔ دونوں میں سے ایک کو جب بھی موقع ملتا وہ دوسرے کے پاس پہنچ جاتا۔ چائے کا دَور چلتا، سانپوں اور جوگیوں کی باتیں شروع ہو جاتیں اور پھر یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ کئی کئی دنوں پر محیط ہو جاتا۔

ایک مرتبہ سکم کے کباڑیے نے میجر لیئر کو بتایا کہ اس کے یہاں تبت کا ایک بنجارا آیا ہُوا ہے جو ملنے کی چیز ہے۔ میجر صاحب فوراً تیار ہو گئے۔ دونوں کے درمیان بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور میجر صاحب اس کی داستانوں کی کافی میں کریم بن کر گھلتے رہے۔ اچانک بنجارے نے کہا "میجر صاحب ہمارے اِدھر نیپال اور تبت کی اندرونی گہرائیوں میں کرگدانوں کا ایک بہت بڑا غول ہے جو چرنے چگنے کے لیے صرف رات کے وقت پہاڑوں کی ڈھلان

پر آتا ہے اور پھر غاروں میں گم ہو جاتا ہے۔"

"کس کا غول؟" میجر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کرگدانوں کا ریوڑ میجر صاحب۔ یونی کارن کا۔"

"وہ گھوڑا جس کے ماتھے میں ایک بل دار سینگ ہوتا ہے۔" میجر نے پوچھا۔

"وہی — وہی۔" بنجارے نے کہا۔ "بالکل وہی۔ اُن کا ایک غول تبت کی ترائیوں میں گھوم رہا ہے۔"

"لیکن کرگدانا کی کوئی وجودی حقیقت تو نہیں۔" میجر نے کہا۔ "یہ تو مائیتالوجی ہے، تصوراتی وجود ہے، دیومالائی کہانیوں کا جانور ہے۔"

"بس۔" بنجارے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تم گورے لوگوں کا علم یہیں تو آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں چشم دید گواہ کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ میں نے اس غول کو کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ اگر انسان کے پاس اچھا سا پھندہ ہو اور تم لوگ ایسی ایجادوں کے بڑے ماہر ہو تو پھر کئی کرگدانے بڑی آسانی کے ساتھ پکڑے جا سکتے ہیں۔"

میجر لیئر تبتی بنجارے کی یہ بات سُن کر واپس چھاؤنی آ گیا۔ آتے ہی سیدھے پہلے اپنا استعفیٰ کرنل کو پیش کیا۔ پھر بنگلے پر جا کر بیوی بچوں کو خدا حافظ کہا۔ یاروں دوستوں سے وداع ہُوا اور بنجارے کے ساتھ سوار ہو کر شمالی پہاڑوں میں کرگدانوں کی تلاش میں نکل گیا۔ پُورے سات سال تک میجر کرگدانوں کے غول کی تلاش میں رہا اور تبتی بنجارا اُس کی راہنمائی کرتا رہا۔ اس عرصے میں وہ بالکل قلاش ہو گیا۔ بھوک پیاس سے ہڈیوں کا ڈھانچہ سا رہ گیا۔ پریدہ رنگ دریدہ لباس۔ جہاں بھی جا کھڑا ہوتا لوگ دیوانہ دیوانہ کہہ کر اس کے قریب سے بھاگ جاتے۔ تبت کے نواحی گاؤں میں اس کی کہانیاں مشہور ہو گئیں، لیکن اس نے تلاش کی مہم جاری رکھی۔ سات سال بعد اُس کا ساتھی فوت ہو گیا تو میجر لیئر اس دُنیا میں اکیلا رہ گیا۔ پھر بھی اس نے کرگدانوں کے ریوڑ کی تلاش نہ چھوڑی اور تین سال اور تک پہاڑوں کے دامنوں اور سلسلۂ کوہ کی غاروں میں اُنہیں تلاش کرتا رہا۔

جب اُس کی حالت بالکل غیر ہو گئی اور رُوح اور جسم کا رشتہ واجبی سا رہ گیا تو وہ پا پیادہ

واپس ڈیرہ دون پہنچا۔ اب یہاں نہ اُس کا گھر تھا نہ بیوی بچے، نہ پلٹن تھی نہ اُس کے ساتھی، نہ کوئی واقف کار نہ کسی سے جان پہچان۔ سِکّم کا کیا ٹیا عرصہ ہُوا مر چکا تھا۔ میجر لیئر مانگتا، پِنیتا، دریوزہ گری کرتا پاپیادہ کلکتہ پہنچا اور مسالچی کی حیثیت سے ایک جہاز کے باورچی خانے میں ملازم ہوگیا۔ یہ جہاز انگلستان جارہا تھا۔ کوئی ایک مہینہ مسالچی کی نوکری کرنے کے بعد اس نے جہاز پر ہی حجامت بنانے کا کام سیکھا اور پھر مسافروں کی حجامتیں بنانے لگا۔

جب وہ لندن پہنچا تو اُس نے کنگھی قینچی اور اُسترا خریدا اور برائیٹن میں لوگوں کی حجامتیں بنانے لگا۔ آٹھ سال تک لوگوں کی حجامتیں بنانے اور خط کرنے کے بعد اس نے بال بڑھانے کا ایک لوشن بنایا جو وہ ہر گاہک کو زبردستی دیا کرتا۔ ایسی پُرسکون اور ہموار زندگی گزارنے کے بعد مسٹر لیئر ایک دن فوت ہوگیا اور محلّے کے لوگوں نے اپنے نائی کو عزت و آبرو کے ساتھ دفن کردیا۔

لیکن ایک تلاش ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو اُس کا علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ تلاش کررہا ہے یا اس کو کسی چیز کی چِنتا ہے یا وہ کوئی رستہ ڈھونڈ رہا ہے یا اُسے کسی شے کی تلاش ہے۔ پھر بھی یہ عمل جاری رہتا ہے اور مرتے دَم تک اس کو اس بات کا سُراغ نہیں ملتا کہ وہ اس قدر بے چین کیوں ہے، خالی کیوں ہے، اس کی روح کے اندر ایک تھرتھری سی کیوں رہتی ہے؟

"اُس کو بُلالاؤ جو ابھی ہمارے درمیان بیٹھا تھا۔"

"اُن سے کہنا کہ ابھی ذرا ٹھہریں۔"

"اور وہ جو لان کی پیلی دُھوپ میں لیٹا تھا؟"

"کیوں میاں چِڑوا ہے کبھی کوئی اس کھنڈر کے اندر بھی گیا ہے؟"

"وہ جس کے ماتھے پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ ہاتھ میں شادی کی دو لکیریں تھیں۔ منہ سے کسی اور منہ کی بُو آرہی تھی۔ وہ کون تھا؟"

"IS THERE ANYBODY THERE?"

"چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد۔"

"جب اوّل فنا ہے تو آخر فنا ہے، تو پھر 'حالتِ متوسط' کا کیا اعتبار؟"

"PRONTO ! SCUSI-DI-CHI-PARLI ? "

"اور وہ جو شاید ابھی ہمارے درمیان موجود تھا وہ کدھر چلا گیا"؟

ایک شام ہم لاہور ریڈیو سٹیشن کے ٹوٹے ہوئے صوفے پر بیٹھے تھے تو کسی نے امانت علی خان سے پوچھا: "خان صاحب آپ کیوں گاتے ہیں؟" تو امانت نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہوا میں لہرا کر بولا: "واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، کوئی سوال ہے، کوئی سوچنے کی بات ہے کوئی مسئلہ ہے، سیدھی بات ہے کہ میں . . ." اور پھر وہ رک گیا، دس پندرہ سیکنڈ تک خاموش رہا پھر ہنس کر کہنے لگا "پتہ نہیں کیوں گاتا ہوں، کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے متعلق حد ہو گئی . . . ہاں سچ یار دوستی بتاؤ کہ میں کیوں گاتا ہوں، گانا مجھے کیوں اچھا لگتا ہے، روٹ پرمٹ کیوں اچھا نہیں لگتا"۔

پھر ہم سب خاموش ہو گئے اور اپنی اپنی جگہ غور کرنے لگے لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہمارے درمیان ایک پرانا، دھرانا سیانا اور پڑھا لکھا فلسفی بھی تھا، اس نے انگلی اوپر اٹھا کر کہا: "یہ تلاش کا مسئلہ ہے، آرٹسٹ کے اندر جستجو ہوتی ہے، حقیقت کی جستجو، اپنی تلاش، حق کی تلاش، کھوئے ہوئے کی تلاش، نہ کھوئے ہوئے کی جستجو، وہ کھوج میں گاتا ہے، تصویریں بناتا ہے، سنگتراشی کرتا ہے، شعر لکھتا ہے، رقص کرتا ہے اور دور نکل جاتا ہے"۔

"لیکن مجھے تو کسی کی تلاش نہیں" امانت نے کہا۔ "میں نے کسی کو نہیں کھویا، مجھے تو کسی کی جستجو نہیں، پھر میں کیوں گاتا ہوں"؟ اور ہم سب نے سوچا کہ چونکہ اس نے گانا سیکھا ہے، اس لیے گاتا ہے اور چونکہ اس کے گھرانے کی ریت یہی ہے، اس لیے وہ اس ریت کو نبھا رہا ہے، لیکن ہم سب غلط سمجھتے تھے۔

چونکہ ابھی تک کوئی ایسا آلہ وضع نہیں ہوا جو انسان کے اندر کو ماپ سکے اور اس کی گہرائی کو آنک سکے، اس لیے ہم نے ایک غلط فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے میں خود آرٹسٹ بھی شریک تھا بلکہ پیش پیش تھا۔

میرے حساب سے آرٹسٹ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہوتا ہے، وہ بھی اپنے نفع اور نقصان کو سمجھتا ہے، اپنی بہتری کے پروگرام بناتا ہے، اپنی مادی ترقی میں دلچسپی لیتا ہے، وہ بھی حسابی کتابی ہوتا ہے، حصولِ زر کی خواہش رکھتا ہے، اپنے ذہن کے اندر ایسے پٹرول پمپ اور

ایسے باغ لگا تا رہتا ہے جس سے گھر بیٹھے معقول آمدن ہوتی رہے کٹڑیاں اور عمارتیں اُٹھاتا ہے جن سے کرایہ ملتا رہے بس میں سفر کرتے ہوئے کئی دفعہ پکار کر کہتا ہے "یار تم نے میرے پندرہ پیسے واپس کرنے ہیں" کئی فرلانگ لمبا سفر کر کے سستی چیز خریدنے جاتا ہے۔ گھر والوں کے مقابلے میں اپنی ذات کو ترجیح دیتا ہے ہماری طرح سے خوش اطوار ہوتا ہے اور بڑے سلیقے کے ساتھ کمینہ پن کرتا ہے۔ حسد بُغض عناد کینہ غیبت طعنہ اس کے اجزائے زندگی ہوتے ہیں لیکن اس کے اندر کا ایک میٹر ان ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ یہ میٹر اس کے دل کے نیچے جگر کے پاس یا پھر اپنڈکس کے قریب ہوتا ہے۔ باکیں اور۔ اس کی اسے مطلق خبر نہیں ہوتی نہ وہ اس کی فنکشن سے آشنا ہے نہ اس کی موجودگی کا علم رکھتا ہے۔ عین اسی طرح جس طرح ہم کو یاد نہیں رہتا کہ ہمارے اندر گردے لگے ہیں اور وہ کچھ کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح آرٹسٹ کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اندر ایک میٹر لگا ہے اور وہ اپنا کام کر رہا ہے۔

جس طرح ماہرین طبقات الارض گگر کاؤنٹر سے زمین کے اندر معدنیات تلاش کرتے ہیں اسی طرح آرٹسٹ کے اندر کا میٹر کسی انہونی شے کو کسی انوکھے رنگ کو کسی بے نام سُر کو تلاش کرتا رہتا ہے اور اس کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ اس کے اندر تلاش کا عمل جاری ہے جیسے ہمارے اندر تقطیر کے عوامل کی ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوتی لیکن یہ عمل جاری ہوتے ہیں۔ اسی کانوں کان خبر نہ ہونے کی وجہ سے امانت علی نے بھی بڑی معصومیت کے ساتھ کہہ دیا کہ اس کو تو کسی کی تلاش نہیں، کسی کی جستجو نہیں۔

چھ سات سال اِدھر کی بات ہے۔ ریاض محمود کے کمرے میں امانت علی سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ خاموش کچھ گواچا ہوا اور کچھ خوش سا تھا۔

ریاض نے کہا "کیا بات ہے خاں صاحب کچھ ہماری دید نہیں کر رہے ہو۔ کیا ناراضی ہے یا ہم سے کوئی خطا ہو گئی ہے؟"

امانت نے ذرا سی پریشانی تھوڑی سی شرمندگی اور ہلکی سی پریشان مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "ایک عجیب سا واقعہ ہو گیا اشفاق صاحب میں کراچی گیا ہوا تھا ایک کنسرٹ کے سلسلے میں، وہاں خوب محفل جمی، بڑی داد ملی، پھر چند صاحب لوگوں نے

ایک سولو نشست کی فرمائش کی۔ رات گئے تک میں غزلیں گاتا رہا۔ خوب سماں بندھا، بڑا لطف آیا، وقت ٹھہر سا گیا، میرے اندر ایک عجیب عاجزانہ سا تکبر پیدا ہو گیا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔۔۔ اوپر سے تو میں کانوں کو ہاتھ لگاؤں، لیکن اندر سے مجھے خوشی ہو کہ اور کوئی اس طرح سے غزل نہیں گا سکتا۔ یہ بڑی عجب کیفیت ہوتی ہے۔ بابا آدم کو بھی اسی طرح کی ندامت ہوئی ہو گی اور ساتھ خوشی بھی کہ ممنوعہ پھل کھا کر دکھایا، آدمی فرشتوں سے اوپر سا ہو جاتا ہے، جیسے فرشتے اسے پھر سجدہ کر رہے ہوں اور وہ شرمندگی سے، ندامت سے اور خجالت سے اُن کے آگے ہاتھ باندھ کر رونے لگ جائے، میری آواز میں رونے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اسی محفل میں ایک خاتون تھی گہرے کتھئی رنگ کی قیمتی سی ساڑھی پہنے۔ اُس کی کمر میں ریڑھ کی ہڈی بہت گہری تھی، بڑی خوبصورت کمر تھی، ریاض صاحب! میں نے تو پہلے کبھی عورت کی کمر کے بارے میں اس طرح سوچا ہی نہ تھا۔ بڑی کوئی اُونچی قسم کی خاتون تھی، اونچی ناک والی، کم گفتگو کرتی تھی اور تھوڑی اُٹھا کر بیٹھی تھی، میرا خیال ہے کہ وہ غزلوں کے مشکل شعر سمجھتی بھی نہیں تھی، وہ ایسی خوبصورت اور اتنی طرحدار تھی اشفاق صاحب کہ میرا دل چاہنے لگا کہ میں اس سے کوئی بات کروں اور وہ مجھے میرے سوال کا لمبا جواب دے، کافی لمبا دیر تک نہ ختم ہونے والا، لیکن اس نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی، مزے سے بیٹھی سگریٹ پیتی رہی۔ پھر کوئی ڈیڑھ پونے دو بجے ہوں گے رات کے۔۔۔ ہم محفل سے باہر نکل کر چلنے لگے، تو وہ میرے قریب آ کر بولی: "آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں امانت صاحب؟"

"ہم: میں تھوڑا سا گھبرا گیا اور ذرا سوچ کر بولا "بیبی جی ہوٹل میں اور ہم لوگ کہاں ٹھہریں گے"

اس نے اسی طرح ناک اُوپر اُٹھا کر کہا: "آپ میرے ساتھ گھر چلیئے آرام سے سوئیے اور صبح کا ناشتہ کر کے آ جائیے۔" مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ریاض صاحب کہ میں نے اس کی بات کا جواب دیا یا نہیں، لیکن میرے اندر ایک خوبصورت تنہائی سی بجی اور میں اس کے ساتھ کار میں سوار ہو گیا، عجیب سی کار تھی۔ اس کے اندر کئی میٹر مختلف رنگوں کے چل رہے تھے، میل بتانے والی سوئی نہیں تھی، پارہ سا اُوپر کو چڑھتا تھا۔ اسی طرح کی اور بلا بتر کئی گھڑیاں، سوئیاں تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹہ سنسان سڑکوں کو چاٹتے ہم اس کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ ڈرائیو وے کے دونوں طرف پام کے بڑے بڑے درخت

تھے۔ برآمدے کے ستونوں پر سبز سلیں چڑھی تھیں۔ درمیانی محراب میں مینا کا پنجرہ لٹک رہا تھا اور مینا سو رہی تھی۔ پھر ہم ڈرائنگ رُوم میں جا بیٹھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک ملازم برف گلاس اور چھوٹی بڑی بوتلیں ایک ٹرالی میں رکھ کر لے آیا۔ اس نے بلور کے ایک گلاس میں ہلکی کافی کے رنگ کی شراب ڈالی اور چاندی کی چمٹی سے برف کے ٹکڑے پکڑ کر اس میں چھوڑ دیے۔

پھر کہنے لگی: "آپ کون ہیں امانت صاحب"؟

مَیں نے جلدی سے کہا "ہم جی پٹیالے کے رہنے والے ہیں اور ہمارا گھرانہ پٹیالے کی گائیکی کا گھرانہ ہے اور میرے دادا مہاراج کے دربار میں کرنیل کا رُتبہ رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے زمانے میں"۔۔۔

لیکن وہ مسکرانے لگی اور ہنس کر بولی: "مَیں نے پوچھا تھا آپ کون ہیں؟"

"مَیں تو جی شرمندہ سا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اب اس کو کیا بتاؤں کہ مَیں کون ہُوں اور سچ جانیں تو مجھے خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ مَیں کون ہُوں۔۔۔ ایک خاموشی سی چھا گئی۔۔۔"

اس رات مَیں نے بہشت دیکھا ریاض صاحب! مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ بہشت کیسا ہوتا ہے، بس کتابوں میں پڑھا تھا اور بزرگوں سے سُنا تھا، لیکن اصل بہشت اشفاق صاحب آپ میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ کیسا ہوتا ہے۔ جس طرح جس آدمی نے کبھی رائے ونڈ نہیں دیکھا اس کو اپنے علم کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ رائے ونڈ کیسا ہو گا، لیکن اصل رائے ونڈ اور ہی طرح کا ہوتا ہے۔ کتاب والے اور علم والے رائے ونڈ سے مختلف۔ اسی طرح اصل بہشت اور ہے اور کتابوں کا بہشت اور۔

صبح جب بابا ناشتہ لایا تو ہم ڈرائنگ رُوم ہی میں بیٹھے تھے۔ جب وہ مجھے اپنی کار میں ڈال کر ہوٹل کے لیے چلی، تو مینا جاگ چکی تھی اور چونچ سے پَر کر رہی تھی۔ اس نے سارے راستے کوئی بات نہ کی اور مجھے ہوٹل پر اُتار خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ جاتی ہوئی کار میں مَیں نے آخری چیز اس کا پرس اور پرس کے پاس پڑی ہوئی سگریٹوں کی ڈبی دیکھی تھی۔"

"تم نے اس کا پتہ نوٹ نہیں کیا امانت"؟ ریاض نے ہکلا کر پُوچھا۔

"کیا جناب کیوں نہیں، یہ دیکھو، یہ دیکھو نوٹ بک میں درج ہے، فون نمبر بھی ہے"

"بس پھر تو مزے ہیں" ریاض نے کہا۔

"لیکن خوف سا بھی ہے ریاض بھائی اور اس خوف کی مجھے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب امانت نے بڑے خوبصورت کڑھے ہوئے ریشمی کُرتے پہننے شروع کیے۔ گریبان کے آگے بَل کھاتے ڈورے اور آستینوں کے پاس ڈولتے ہوئے پھُمن لیکن یہ ساری آرائش اور یہ خوبصورتی اور اتنی بہت مقبولیت اس کا خوف اور اُداسی دُور نہ کر سکی۔

پھر ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ چُپ چاپ اکیلا کراچی چلا گیا۔ شاید کوئی اور بھی جانتا ہو لیکن مجھے اور ریاض محمود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس کم گو کی آواز سُننے کے لیے ترستا گیا ہے۔ دُنیا کے اتنے گلوکاروں میں سے اس کو صرف ایک وہی آواز پسند آتی تھی جو شاید رُک رُک کر نکلتی تھی لیکن ہر فقرے پر پورے سُر لگتے تھے۔

تیسرے دن امانت واپس آگیا ہم نے اس سے گوہرِ مقصود کی بابت پُوچھا تو کھسیانی سی ہنسی ہنس کر خاموش ہو گیا۔ ریاض نے کہا "اشفاق صاحب یہ بہشت سے نکلنے کا افسوس ہے اور اس میں بات کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔"

امانت نے کہا کون سا بہشت اور کیسا بہشت، ریاض صاحب! وہاں تو کوئی بھی نہیں کچھ بھی نہیں۔ اک خواب سا تھا اب اس کی یاد باقی رہ گئی ہے۔"

کراچی پہنچ کر میں سیدھا اُس کے بنگلے پر گیا تھا گھنٹی بجائی اندر سے ایک بوڑھا پارسی نکلا میں نے بیگم صاحب کی بابت پوچھا تو اس نے کہا کون سی بیگم صاحب بابا کدھر کی بیگم صاحب اِدھر تو کوئی ایسا نہیں۔"

میں نے نوٹ بک آگے کر دی اس نے غور سے نام اور پتہ پڑھا پھر ہنس کر بولا "وہ تو یہ بنگلہ چھوڑ گئی یہ تو ہم نے کرائے پر لے لیا ہے۔"

"اور وہ کہاں چلی گئی؟"

"اس کا ہم کو کیا معلوم ہم کوئی ہر ایک کا نام اور پتہ تو نوٹ کر کے نہیں رکھتا جاؤ شاباش۔"

میں نوٹ بک جیب میں ڈال کر واپس چلا آیا۔ تھوڑی سی کوشش کی جہاں جہاں سے ان کا پتہ معلوم کر سکتا تھا کیا لیکن کوئی اثر آثار ان کا نہ ملا پتہ نہیں وہ سچ مچ کوئی مخلوق تھی یا مجھے دھوکا ہوا تھا جب مجھے مینا کا پنجرہ یاد آتا ہے تو لگتا ہے کہ خواب تھا کوئی طلسماتی مقام تھا لیکن

جب پیٹی کوٹ اور بلاؤز کے درمیان ریڑھ کی ہڈی گہری نالی بناتی ہے اور ہاتھ اُسے محسوس کر سکتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے حقیقت تھی، پتہ نہیں کیا تھا، جی آپ ہی کچھ اندازہ لگائیں۔"

ہم دونوں اس کے ساتھ مل کر اندازہ لگاتے رہے، لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔

پھر امانت گاتا رہا اور خوب گاتا رہا اور خوب خوش رہا اور ہم سے ملتا رہا اور اس واقع پر ہنستا رہا اور ہم کو ہنساتا رہا اور لطیفے سناتا رہا اور بس کنڈیکٹر سے پندرہ پیسے بھی واپس مانگتا رہا، لیکن اس کے اندر تلاش کا گگر کاؤنٹر اور تیز ہو گیا، میناوالی کی تلاش نہیں، صاحب نظر لوگوں کی تلاش نہیں، بس۔

تلاش! تلاش!! تلاش!!! جس کا احساس آرٹسٹ کو کبھی نہیں ہوتا، جیسے سائیکل سوار کو کبھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ پاؤں چلا رہا ہے؟ آدمی کو محسوس نہیں ہوتا کہ اس کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہے!

جب امانت علی مر گیا اور اس کی موت کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی تو اجمل ایکٹر سڑک کے کنارے کھڑا تھا، اس نے مجھے ہاتھ دے کر روکا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے چہرے کو مخصوص انداز میں ٹویئچ کرنے کے بعد بولا: "بھاجی ایہہ دسّو کہ امانت مر کیوں گیا؟"

مَیں نے کہا "اجمل صاحب آرٹسٹ مرتا نہیں رُوٹھ جاتا ہے۔"

کہنے لگا "رُس جاندا اے! کِدھے نال؟"

مَیں نے کہا "اپنے ماحول کے ساتھ، اَن ہونیوں کے ساتھ اور اس میں اجمل صاحب معاشرے کا اور ماحول کا بھی کوئی قصور نہیں ہوتا، معاشرہ بڑا اچھا ہوتا ہے، آرٹسٹ سے بڑی محبت کرتا ہے، اس کی بڑی ضدیں پوری کرتا ہے، اس کو مرنے سے، شراب پینے سے، بوہیمین ہونے سے، تباہ ہونے سے نہیں روکتا، لیکن پھر معاشرے کا بھی چند چیزوں پر بس نہیں چلتا۔"

"او وہ کس طراں"؟ اجمل نے پوچھا۔

مَیں نے کہا "آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے مجھے ایک کوزہ لے دو، کچی مٹی کا کچا کوزہ، اور معاشرہ فوراً اسے ایک کوزہ فراہم کر دیتا ہے، پھر آرٹسٹ کہتا ہے مجھے ایک ہاتھی لے دو اور معاشرہ فوراً اپنی تمام تر پُونجی جمع کر کے اُسے ایک ہاتھی لے دیتا ہے، پھر آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے، اس ہاتھی کو اس کوزے میں ڈال دو، اس وقت معاشرہ مجبور ہو جاتا ہے اور اپنی بے لسی کا اظہار کرتا ہے، اس پر آرٹسٹ ناراض ہو جاتا ہے اور رُوٹھ جاتا ہے اور منتا نہیں اور چلا جاتا ہے۔"

اجمل نے حیران ہو کر کہا: "بھا جی لیکن او ہدا تے آپریشن نہیں ہو سکیا وقت سِر اپنڈیکس دا آپریشن سی ڈاکٹراں توجہ نہیں دِتی۔"

مَیں نے کہا: "نہیں یار، اپنڈیکس خراب نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ایک اور میٹر ہوتا ہے۔ ایک گگر کا ڈسٹرڈ وہ تیز ہو جاتا ہے اس کی فری کوئنسی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور انسانی جسم اس کی تاب نہیں لا سکتا۔"

"ایہہ میٹر کی کر دا اے بھا جی؟" اجمل نے پوچھا۔

"اس کو کسی کی تلاش ہوتی ہے، کسی شے کی جستجو ہوتی ہے۔"

"کدھی؟ کیہڑی شے دی تلاش؟"

"اس کی مجھے بھی خبر نہیں، خود آرٹسٹ کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا، تم کو بھی پتہ نہیں بھائی اجمل یہ تپدق اندر کی ہوتی ہے نہ دیکھنے والے کو علم ہوتا ہے نہ معالج کو نہ خود مریض کو۔"

پھر لکشمی چوک تک میرے اور اجمل کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔

جس طرح اجمل میرے پہلو میں خاموش بیٹھا امانت کی موت کے بارے میں سوچ رہا تھا، اسی طرح ہم ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے اور خاموش تھے۔ ہم نے اتنا طویل سفر ساتھ ساتھ طے کر لیا تھا کہ اب ہم ایک دوسرے سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔ تھکے ہوئے سے، دبے ہوئے سے، زبردستی کے بُردبار بنے ہوئے سے اور دوست بنے ہوئے سے۔ جس طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہ کر اوب جاتے ہیں اور بیزار ہو جاتے ہیں اور پھر ساتھ ہی رہتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور ہمارے اندر اور باہر میں وہی قبولیت تھی جو ہماری بیویوں کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ ہم خوش تھے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ہمارے درمیان محبت اور یگانگت کا رشتہ قائم ہے۔

اتنے میں ایک مردِ بزرگ ہمارے قریب سے گزرا۔ اس نے سر پر کُلّے والی سفید پگڑی باندھی ہوئی تھی، گلے میں لمبا کرتہ تھا۔ نیچے کھُلا سا تہبند تھا اور پاؤں میں چمڑے کے سیاہ بوٹ تھے جن کے تسمے کھُلے ہوئے تھے۔ اس بزرگ مرد کی ڈاڑھی سیاہ اور چمکدار تھی۔ اس نے ایک رات بیچ تیل لگا کر ڈبل خضاب کیا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزرا تو مسعود اور کوہستانی نے ایک ساتھ

"السلام علیکم" کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح سر جھکائے قریب سے گزر گیا۔ مسعود نے ذرا رک کر پیچھے مڑ کے دیکھا تو کوہستانی نے کہا:

"دفع کرو صیب۔ دیوث کا بچہ۔ سلام کا جواب دینا نہیں جانتا۔"

"بھئی اب پریوں کا علاقہ شروع ہو گیا دوستو۔" مفتی نے اعلان کیا "اب سلام کا جواب نہ ملے تو غصہ نہ کرو خدا خبر کون کیا ہے اور کیا کیا چیز ہے۔"

"بھئی واہ" اعظمی خوش ہو کر بولا "یہ سالی گرامر بھی پریوں کے دیس میں آ کر بدل جاتی ہے۔ کیسے کیسے خوبصورت جملے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ مفتی جیسے بے زبان آدمی سے۔"

"مفتی اور بے زبان؟" عماد نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اس کی زبان کا چسکا ہی تو ہم کو جنگلوں اور بیابانوں میں اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے۔"

مسعود نے کہا: "یہ اعظمی بڑا کھچرا ہے۔ بدزبان کی جگہ بے زبان کس خوبی سے استعمال کر گیا ہے کہ مفتی کو برا نہیں لگا اور ہم سب کو خبر بھی ہو گئی۔ کیوں شاہ جی؟"

میں نے کہا "لیکن یہ آدمی جو ابھی ہمارے قریب سے گزرا تھا یہ تو دتو ملنگ تھا۔" سب اپنی اپنی جگہ پر رک گئے۔

میں نے کہا: "آج سے چالیس برس پہلے جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو ایک ایسا ہی آدمی ہمارے گاؤں کے ایک کھنڈر میں رہتا تھا۔ اس کا نام دتو ملنگ تھا اور وہ بوٹی پیا کرتا تھا۔"

"یہ وہی ہے یا اس جیسا ہے؟" مفتی جی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ تو جبھی مر گیا تھا۔" میں نے آرام سے کہا "لیکن یہ بھی وہی ہے۔"

"یعنی کیا اس کی شکل اس سے ملتی ہے؟" مسعود نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا قد بت؟" لیڈر بولا۔

"نہیں۔"

"شاید اس کی ڈاڑھی، چلنے کا انداز، بالوں کی رنگت۔" عماد نے میری مدد کی۔

"نہیں یہ بھی نہیں۔"

"تو پھر بھائی اس کا کچھ اور ملتا جلتا ہوگا۔" اعظمی نے کہا۔ "کچھ چیزیں ایسی غیر مرئی بھی ہوتی ہیں جو کسی کسی کو نظر آتی ہیں۔ وہ ملتی ہوں گی۔ کیوں شاہ جی؟"

مَیں نے کہا۔ "نہیں یار ایسی تو کوئی بات نہیں؛ البتہ مجھے یہ آدمی وہی لگتا ہے۔ گو اس سے سن و سال میں بہت ہی چھوٹا ہے۔" پھر مَیں نے نیچے ڈھلان کی طرف دیکھا۔ پہاڑ کے بَل کھاتے ہوئے راستے پر وہ شخص تیزی سے نیچے اُترتا جا رہا تھا اور اس نے اپنے چہرے کے گرد پگڑی کا شملہ لپیٹ لیا تھا۔ ایک مَیں نے ہی نہیں ہم سب نے اس کو باری باری سے دیکھا اور ایک دوسرے کو احساس دلائے بغیر دیکھا کہ ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔

کوہستانی نے زمین پر جُھک کر کہا۔ "ایک پتھر ماروں دیوث کے سر پر۔"

اور ہم سب نے ناں ناں! ناں ناں!! خان ناں کہہ کر اس کو پتھر مارنے سے منع کیا۔

لیڈر نے کہا۔ "بھئی چلنا ہے تو جلدی جلدی قدم اُٹھاؤ اور اگر رُکنا ہے تو تھوڑی دیر قیام کرلو۔ یہ درمیانی ڈھیل ڈھال درست نہیں۔"

ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ "چلنا ہے بابا چلنا ہے۔ راستہ لمبا ہے اور وقت کم ہے۔ ہم کو ضرور چلنا ہے۔"

کوہستانی نے کہا۔ "تا پلار دے . . ." اور پھر ایک پتھر اُٹھا لیا۔

"ہیں ہیں ہیں۔" مُفتی نے کہا۔ "کیا کرتے ہو خان جانے دو۔ اس کو جانے دو۔"

"کافر ہے صیب۔" کوہستانی نے کہا۔

"ضرور ہوگا۔" اعظمی نے جواب دیا۔

"بدبخت کا بچہ ہے جی۔"

"صاف نظر آتا ہے۔"

"وَتے کا بچہ ہے۔"

"بالکل۔ وہ تو اس کی چال سے ظاہر ہے۔" اعظمی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"تو پھر اس کو ماریں صیب۔"

"دفع کرو خان۔ ہم کو اس سے کیا۔ سلام کیا۔ کیا نہ کیا۔" مُفتی نے کہا۔ "خدا اس کو جو

لیکن یہ بات کوہستانی کے دل نہ لگی۔ وہ ہمارے ساتھ چلنے تو لگا لیکن برابر پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا اور سیاہ بوٹوں والا سفید دھبہ تیزی سے نیچے کی طرف بڑھتا رہا۔

"جب میں دسویں میں پڑھتا تھا" میں نے کہنا شروع کیا۔ "تو میں دِتو ملنگ کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ میں اپنے سکول کا ایک اچھا ہونہار طالب علم تھا اور میرے ساتھ میرے سکول کی کئی اُمیدیں وابستہ تھیں اور ہمارا امتحان بہت قریب تھا اور میں دِتو ملنگ کے تحیّر میں گم ہو گیا تھا۔

دِتو ملنگ ہمارے قصبے کی ایک پُرانی حویلی میں، جو کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی، رہتا تھا۔ اس کو باہر آتے جاتے، مانگتے پیتے، سوتے جاگتے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہو گا۔ پتہ نہیں وہ کیا کھاتا اور کہاں سے کھاتا تھا؟

اُس کے سارے جسم پر کوئی بال نہ تھا اور اس کی کھال جگہ جگہ سے اچٹی ہوئی تھی۔ سارا بدن خارش زدہ کتے کی طرح سنولایا ہوا تھا اور جھری دار تھا۔ ایک سلور کے کٹورے میں گیرو تیل اور توے کی کالک کا وارنش سا پڑا رہتا جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفے پر اپنے بدن پر ملا کرتا۔ ہر وقت سلگتے ہوئے اُپلوں کے اندر مٹی کی ایک ہنڈیا پکا کرتی اور اس ہنڈیا کے پاس ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا چاقو پھل کے بل زمین میں دھنسا رہتا۔

پہلے تو میں سکول سے تفریح کے پیریڈ میں پھٹا کھا کر دِتو ملنگ کے پاس جاتا اور اس کے سامنے بچے جمورے کی طرح بیٹھا رہتا۔ پھر میں دوسرے پیریڈوں میں بھی کھسکنے لگا۔

"لیکن تو وہاں جانے کیوں لگا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"ہاں، یعنی کیا دلچسپی تھی تم کو شاہ جی" مسعود بولا۔ "کون سی کشش تھی؟"

"کچھ نہیں" میں نے کہا۔ "کوئی دلچسپی نہیں تھی، کوئی کشش نہیں تھی۔ پھر بھی میرا دل اس کے پاس جانے کو چاہتا تھا اور اس کے چمکدار، مردار اور رنگے ہوئے چمڑے کو دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ اُپلوں کی آگ کے پاس بیٹھ کر مکھن کا ایک گولا سا دھویا کرتا اور کہا کرتا، سو مرتبہ دھونے سے مکھن زہر بن جاتا ہے۔ میں زہر بنا رہا ہوں۔"

"لیکن آپ کا فنکشن وہاں کیا تھا شاہ جی؟" عماد نے مثبت انداز میں پوچھا۔

"میرا فنکشن کوئی خاص نہیں تھا۔ بس میں اس کا بچہ جمورا تھا، ساتھی تھا، ملازم تھا، کمی تھا۔ پتہ نہیں میں کیا تھا اور میرا خاص فنکشن کیا تھا، لیکن میں اس سے متاثر تھا اور اس قدر متاثر تھا کہ اس کے بعد پھر کسی سے اس قدر متاثر نہ ہو سکا۔"

"لیکن ہوئے کیوں؟" مفتی نے پوچھا۔

"یہ پتہ نہیں مفتی جی" میں نے کہا۔ "اس بات پر میں نے کبھی غور نہیں کیا، البتہ اگر آپ مجھے ضعیف الاعتقاد تصور نہ کریں تو میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے دیکھا کہ ایک لق و دق صحرا ہے اور اس کے اندر خشک اور پتیلے پہاڑوں کے درمیان ایک دریا بہتا ہے۔ اب پتہ نہیں میں نے یہ خواب دیکھا تھا یا میرا ایسے ہی تصور تھا یا میں نے جاگو میٹی میں ایک فلم دیکھی تھی۔ . . میں اس دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں اور میرے ہاتھ میں مچھلی پکڑنے کی ڈور اور کانٹا ہے اور کانٹا اتنا بڑا ہے کہ کبھی میں اسے اس ہاتھ میں پکڑتا ہوں اور کبھی دوسرے میں۔ ایک بڑے سے پتھر کے سامنے دریا کے اندر مجھے بہت سی مچھلیاں اچھلتی اور جھاگ اڑاتی دکھائی دیتی ہیں۔ میں اس کانٹے کی نوکوں پر آٹا چڑھائے بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ کانٹا دراصل مچھلی پکڑنے کا کانٹا نہیں ہے، بلکہ ترشول کی طرح سے ہے یعنی اس کی تین نوکیں ایک افقی بار پر نکلی ہوئی ہیں اور آگے سے سیدھی لیکن بہت ہی تیز ہیں۔ جب ان تینوں نوکوں پر آٹا چڑھا کر میں پتھر پر کھڑا ہو کر کانٹا پانی میں ڈالنے کے لیے رسّی گھماتا ہوں تو پیچھے سے دِتّو ملنگ آ جاتا ہے اور گھومتا ہوا کانٹا اپنے ہاتھ سے روک کر کہتا ہے "ناں کاکا جی ناں۔ مچھی ایس طراں نئیں پھڑی جاتی۔ ایدھر لیاؤ مینوں دیو۔"

میں ڈور اور کانٹا اس کے ہاتھ میں دے کر خود پتھر سے نیچے اُتر جاتا ہوں اور دِتّو پتھر کے اوپر چڑھ جاتا ہے۔ پھر وہ کچھ اس ترکیب اور اس مہارت سے ڈور گھماتا ہے کہ اصولاً ڈور اس طرح سے گھوم ہی نہیں سکتی۔ کانٹا ایک مرتبہ سطحِ آب پر ٹپاکھاتا ہے اور پھر ڈور کے سرے پر گھومتا ہوا میرے گریبان سے آ کر چمٹ جاتا ہے۔ میں جس قدر اس ترشول کو اپنے گریبان سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی قدر وہ میرے ساتھ اور چمٹتا جاتا ہے۔ دِتّو ملنگ مسکرائے جاتا ہے اور ڈور کو اپنی طرف کھینچے جاتا ہے۔

میں قدم قدم اس کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ گو میں اس کے قریب جانا نہیں چاہتا۔ اس

کے پاس آرہا ہوں۔ گو مجھے اس سے گھن آرہی ہے۔ اس کے بعد یہ وژن قائم نہیں رہتا اور مَیں آنکھیں کھول کر فضا میں تکنے لگتا ہوں۔ اس واقعے کا یا اس خواب کا یا اس وژن کا مجھ پر کوئی خاص بوجھ نہیں، کیونکہ ہمارا خاندان بہت اُونچے درجے کا تعلیم یافتہ خاندان ہے اور ہم میں سے کوئی بھی ضعیف الاعتقاد نہیں۔

اس وژن کے کوئی تین روز بعد میں نے دِتو ملنگ کا چہرہ "کھیوں والی حویلی" کی اس کھڑکی میں دیکھا جو میری پیدائش سے پہلے کی بند تھی۔ اس کی سلاخیں ضرور موجود تھیں لیکن اس کے چوکھٹے کو گھن کھا گیا تھا۔ مَیں نے دیکھا دِتو نے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور پھر کہا "مچھی پھڑلئی؟"

"کون سی مچھلی؟ مَیں نے جان بوجھ کر اُردو میں پُوچھا۔

"جونسی پکڑن گیا تھا؟"

"مَیں نے کوئی مچھلی نہیں پکڑی" مَیں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"پھر مَیں نے تاں پھڑلئی" اس نے ہنس کر کہا "آجا تیرے کو دخانواں"

میں کچھ دیر تو ہکا بکا اس کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر پتہ نہیں مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ میں سرپٹ بھاگا اور گھر آکر دم لیا۔"

"یہ تم اصل واقعہ بیان کر رہے ہو یا کوئی افسانہ سُنا رہے ہو؟" لیڈر نے پُوچھا۔

"ہے تو اصل واقعہ لیکن مجھے بھی افسانہ ہی لگتا ہے" مَیں نے کہا "اور حیرانی کی بات ہے کہ گزشتہ چالیس سال میں مجھے یہ واقعہ کبھی بھی یاد نہیں آیا"

عماد نے ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہا "مُفتی جی جرح کرنے کی اجازت ہے؟"

"ہرگز نہیں" مُفتی نے ڈانٹ کر کہا۔

"کمنٹ کرنے کی مُفتی؟" مسعود نے پوچھا۔

"بالکل نہیں" مُفتی نے پہلے سے بھی اُونچی آواز میں حکم دیا۔

"تسلیم کرنے کی تو اجازت ہے ناں مُفتی جی" اعظمی نے لجاجت سے پوچھا۔

"قطعی نہیں" مُفتی اور زور سے گونجا اور کوہستانی حیرانی سے ہم سب کا مُنہ تکنے لگا۔

مَیں نے پھر کہنا شروع کیا کہ سکول میں میرا دل نہ لگتا تھا۔ گھر سے مجھے خوف آتا تھا۔ قصبہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا اور کھیموں والی حویلی کے کھنڈر میں ایسی وحشت بھری تھی کہ اس کے اردگرد منڈلاتے رہنے کو دل چاہتا تھا۔ مَیں خوفزدہ بھی تھا اور عشق میں بھی مبتلا تھا۔ تجسس بھی تھا اور ڈر بھی لگتا تھا جیسے کھیت کنارے جھاڑی پر کالا گھاگھرا سوکھنے کو ڈالا ہو اور بھیڑوں کا ریوڑ اس راہ سے گزر رہا ہو بھیڑیں خوفزدہ ہو کر کالے گھاگھرے سے کنی بھی کاٹتی جائیں گی اور اسے دیکھنے اور جاننے کی آرزو میں گردنیں بھی گھماتی جائیں گی۔ ان کا رُخ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ چال بینگی ہو جائے گی اور سارا ریوڑ سیدھا چلنے کے بجائے پہلو کے رُخ چلنے لگے گا۔ ایک گھاگھرے کی بدولت۔ ویسے ایک گھاگھرے کی وجہ سے بڑی بڑی فوجوں کے رُخ بدل جایا کرتے ہیں۔ یہ تو بیچاری بھیڑیں ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری تھی۔

ایک روز دل کڑا کر کے مَیں دِتو ملنگ کے کھنڈر میں چلا گیا۔ وہ صحن کے درمیان پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ کر بُوٹی پی رہا تھا اور رنڈوا بندر سا دکھائی دے رہا تھا۔ کھنڈر کی گری ہوئی دیوار کے پیچھے سے مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے بڑی بُوٹی کا کٹورہ اپنے پیچھے چھپا لیا اور خالی انگلی کے ساتھ جلدی جلدی دانت برش کرنے لگا۔ مَیں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنی منجن والی انگلی روک کر کلرزدہ پلی اینٹوں کی طرف اشارہ کیا اور مَیں چپ چاپ اس خشتی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک ہم دونوں اس طرح خاموش بیٹھے رہے۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر آسمان کو دیکھتا رہا اور مَیں اس کے ماحول، اس کے ساز و سامان اور اس کی شکل و صورت کا جائزہ لیتا رہا۔

پھر وہ اُٹھا اور اپنے بھٹ کے اندر چلا گیا۔ اس کا یہ بھٹ پرانی پلی گیرو والی اینٹوں کا ایک چھوٹا سا ڈربہ تھا جو کسی زمانے میں کھیموں کی مرمتیوں کا گھڑا رہا ہو گا۔ اس کے باہر غلاظت کے انبار تھے اور اس کی چھت ایک طرف سے اندر کو لٹکی ہوئی تھی۔ بھٹ میں داخل ہونے کے لیے وہ چوپائیوں کی طرح اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر اندر جاتا تھا اور اسی طرح باہر آتا تھا۔

مَیں بڑی دیر تک اینٹوں کی اس کرسی پر اسی طرح بیٹھا رہا اور مجھے یُوں محسوس ہونے لگا کہ مَیں بھی ایک بندر ہوں اور دِتو ملنگ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ بندر لوگوں سے اپنا ناطہ توڑنے